علی گڑھ تحریک اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

نعمان بدر فلاحی ○

انیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک مغربی افکار، مادہ پرستانہ معاشرت اور الحادی تہذیب وتمدن کا مقابلہ کرنے اور ان کے منفی اثرات سے معصوم اور نوخیز طلبہ و نوجوانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے جدید اسلوب، منطقی انداز اور سائنٹفک طرز استدلال پر مبنی اسلامی لٹریچر موجود نہیں تھا، جو جدید تعلیم یافتہ نسل کو اپنے بنیادی عقائد، تہذیبی اقدار اور اسلامی طرز معاشرت کا گرویدہ بناتا۔ اکبرالہ آبادی [۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء- ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء] اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال [۹ر نومبر ۱۸۷۷ء- ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء] کے بعد سیّد ابوالاعلیٰ مودودی [۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء- ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء] وہ پہلے فرد تھے، جنھوں نے مغربی افکار اور الحادی تمدن پر نہ صرف یہ کہ کاری ضرب لگائی، بلکہ تمام باطل نظریات کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت، صداقت اور بالا دستی کو نقلی اور عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا۔

شاہ ولی اللہ [۱۷۰۳- ۱۷۶۲ء] کے بعد مولانا مودودی نے برصغیر میں پہلی بار منطقی استدلال کے ساتھ دین کی تعبیر وتشریح کی اور اسلام کو ایک صوفیانہ خانقاہی مذہب کے بجائے مکمل نظامِ زندگی اور تحریک کی شکل میں پیش کیا۔

بیسویں صدی کے تیسری عشرے میں، جب کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے بیشتر طلبہ الحاد اور دہریت کا شکار ہورہے تھے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں ، ماہ نامہ 'ترجمان القرآن' میں (جس کا اجراء ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن سے ہوا) 'مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش' اور 'مسئلہ قومیت' پر ان کے سلسلہ وار مضامین نے طلبۂ علی گڑھ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ لاہور کی 'سیرت کمیٹی' اور

○ ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ای میل: nomanbadaralig@gmail.com

کُل ہند مسلم لیگ ان مضامین کو علی گڑھ میں بار بار مفت تقسیم کر رہی تھی۔ چنانچہ طلبہ کے فکر و نظر میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی گئی اور اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے تسلیم کرنے والے طلبہ کا ایک اسلامی حلقہ قائم ہوا۔(۱)

مولانا مودودی، علی گڑھ سے اپنے ربط و تعلق کے بارے میں خود بیان کرتے ہیں:

''میرے والد مرحوم مولوی سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے ۲ سال پہلے دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور کے طالب علموں میں سے تھے۔ سرسید مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تھا تو وہ اپنے خاندان اور رشتے داروں میں سے بھی بہت سے لڑکوں کو چن کر علی گڑھ لے گئے تھے۔ چونکہ میری دادی کی مرحوم (سرسید احمد) سے قرابت ہوتی تھی' (نعیم صدیقی نے کتاب 'المودودی' میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ''سرسید احمد خاں ایک قریبی رشتہ سے میری دادی کے بھائی ہوتے تھے اور میرے والد اُن کے بھانجے تھے'')۔ اس لیے میرے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا۔ مدرسہ میں سر محمد رفیق اور سر بلند جنگ وغیرہ ان کے رفیق جماعت تھے۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی اس کا حال سب جانتے ہیں۔ میرے دادا کو والد کا علی گڑھ میں تعلیم پانا سخت ناگوار تھا مگر سرسید کے خیال سے خاموش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے اور اتفاقاً ایک جگہ کرکٹ کا کھیل دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ان کی نظر والد مرحوم پر پڑی اور یہ دیکھ کر انھیں سخت رنج ہوا کہ ایک پیر طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ دہلی واپس ہوئے تو دادا صاحب سے مل کر کہا کہ ''بھائی صاحب! احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے، میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند بلا کھیل رہا تھا۔ یہ سن کر دادا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے فوراً والد مرحوم کو علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اس طرح وہ وہاں تکمیل تعلیم نہ کر سکے''۔(۲)

یونی ورسٹی کے سابق طالب علم محمد یوسف بُھٹّہ نے مولانا کے بھائی ابوالخیر مودودی کے حوالے سے لکھا ہے: ''مولانا مودودی کے والد احمد حسن صاحب غالباً دوسرے یا تیسرے بیچ کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، جب اُن کے والد کو یہ معلوم ہوا کہ کافر کرتی پہنے فرنگیوں کے ساتھ

گیند بلا کھیلتا ہے تو انھوں نے اپنے بیٹے کو فی الفور واپس بلا لیا اور تطہیر کے لیے مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس بھیج دیا، جہاں احمد حسن صاحب نے اُن سے باقاعدہ درس حدیث لیا۔ صحیح مسلم پر اُن کے جو نوٹس تھے مولانا گنگوہی بعد میں آنے والے بیچ کے طالب علموں سے کہا کرتے تھے کہ وہ یہ نوٹس لے کر دیکھ لیں۔ مولانا وحید الزماں حیدرآبادی جنھوں نے صحاح ستہ اور قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا ہے' ان کے ساتھ احمد حسن مودودی نے سات مرتبہ 'صحاح ستہ' کا دورہ کیا۔ بخاری اور مسلم وغیرہ کا جو ترجمہ وہ کرتے، نظر ثانی کے لیے احمد حسن صاحب کے پاس بھیجتے۔(۳)

● **سابق طلبہ کی یادداشتیں اور تاثرات :** سابق صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر اسلوب احمد انصاری [۲۸ر جولائی ۱۹۲۴ء- ۳ر مئی ۲۰۱۶ء] کے مطابق: ''میں نے ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ میں گیارہویں کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ اس سے پہلے یونی ورسٹی میں کمیونسٹوں کا غلبہ تھا، لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد اسلام پسندوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا تھا۔ یونی ورسٹی میں سال میں ایک بار اسلامی ہفتہ منایا جاتا تھا، جس کے دوران مباحثہ اور تحریری مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ باہر کے ذی علم، بزرگ اور جید علماء کو اسلام پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا، اسٹریچی ہال میں بعد نماز مغرب ان کی تقاریر ہوتی تھیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی [یونی ورسٹی میں] تشریف لاتے اور پورا ہفتہ قیام کرتے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاری محمد طیب اور مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہ بھی تشریف لاتے تھے، چنانچہ کمیونسٹ اثرات کے خلاف اسلامی ماحول اور مزاج پیدا ہونے لگا تھا۔ ایک بار مولانا مودودی کا 'اولڈ بوائز لاج' میں قیام تھا، میں بھی ان سے ملنے گیا تھا۔ گیارہویں کا طالب علم تھا، ان کی کتابیں 'سیاسی کشمکش' وغیرہ اور 'ترجمان القرآن' کا مطالعہ کرتا تھا۔ کمیونسٹوں کی وجہ سے کیمپس میں لادینیت پھیلی ہوئی تھی مگر چالیس میں ماحول تبدیل ہوگیا تھا، شمشاد مارکیٹ میں ایک دارالمطالعہ قائم تھا۔''(۴)

شعبۂ عربی کے سابق استاذ پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی [اگست ۱۹۲۴ء- ۴ر نومبر ۲۰۱۹ء] کے مطابق: ''میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک یونی ورسٹی اسکول اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک یونی ورسٹی کا طالب علم رہا ہوں۔ سال میں ایک بار اسلامی ہفتہ منایا جاتا تھا، ۴۰ء سے قبل یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ تاریخ کے استاد امیر حسن صاحب اور فلسفہ کے استاذ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب

اس میں پیش پیش رہتے ۔ اسلامی ہفتے کے دوران اُن علماء کو مدعو کیا جاتا جو کانگریس سے دُور اور اس کے مخالف تھے ۔طلبہ کی اکثریت اس زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی سے متاثر تھی اور ان کی تقریر سننے کے لیے بڑی تعداد میں جمع ہوتی تھی ۔ کچھ طلبہ جماعت اسلامی سے بھی وابستہ تھے۔ میں نے جماعت اسلامی کا لٹریچر اسی زمانے میں پڑھا تھا ۔'ترجمان القرآن' کا مطالعہ پابندی سے کرتا تھا۔مولانا مودودی کو اسٹریچی ہال میں سنا ہے اوران سے ملاقات بھی کی تھی'' ۔(۵)

شعبۂ کیمسٹری کے سابق استاد پروفیسر احمد سورتی [۱۳فروری ۱۹۲۲ء- ۲۴/اگست ۲۰۱۷ء] کے مطابق: ''میں نے ۱۹۴۰ء میں گیارہویں کلاس میں داخلہ لیا تھا' مگر مولانا مودودی کی 'سیاسی کشمکش' حصّہ اول اور 'ترجمان القرآن' کا مطالعہ نویں کلاس میں ہی شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اسٹریچی ہال میں مولانا مودودی نے خطاب کرتے ہوئے ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے'' کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ میں اس جلسہ میں شریک تھا۔اس زمانے میں 'سیاسی کشمکش' کے تمام حصّے پڑھ لیے تھے اور 'ترجمان القرآن' کا مطالعہ پابندی سے کرتا تھا ۔شمشاد مارکٹ میں طلبہ کے اسلامی اجتماع میں شریک ہوتا تھا ۔راؤ شمشاد علی اس زمانے میں کافی متحرک تھے ۔مولانا مودودی کے مضامین اوران کا رسالہ 'ترجمان القرآن' اسلام پسند طلبہ میں کافی مقبول تھا'' ۔(۶)

محفوظ الحق حقی علیگ زمانۂ طالب علمی کی یادداشتوں میں لکھتے ہیں : ''اسلامی ہفتہ منانا علی گڑھ کی قدیم روایات میں سے ایک ہے۔ یہ ہفتہ ہر سال بڑے احترام اور شان وشوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔اس زمانے میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اس کے نگراں ہوا کرتے تھے۔ہفتوں پہلے ہندوستان کے جید علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ۔ایک سال مولانا عبدالماجد دریابادی اور نواب بہادر یار جنگ تشریف لائے تو اسٹریچی ہال میں اوپر نیچے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔

پروگرام کے مطابق مولانا عبدالماجد دریابادی کو مقالہ پڑھنا تھا، چنانچہ وہ تشریف لائے اور مقالہ پڑھنا شروع کیا تو اُن کا مقالہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ادھر طلبہ نے بے چینی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنا شروع کر دیا۔مولانا اس بات کو تاڑ گئے اور مقالہ ختم کیے بغیر بیٹھ گئے ۔ صدر اجلاس ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے طلبہ کو ڈانٹ پلائی اور مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنا مقالہ مکمل کریں لیکن وہ تشریف نہ لائے ۔آخر صاحب صدر نے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ سے

تقریر کی درخواست کی۔ اس وقت جلسہ کا ماحول بڑا خراب ہوگیا تھا، ایک مقرر کے لیے بڑا ہی کٹھن وقت تھا، لیکن نواب صاحب کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ آپ ڈائس پر تشریف لائے اور بڑے اطمینان سے مخاطب ہوئے:

''حضرات! اِس سردی کے موسم میں آپ کی دعوت پر پانچ سو میل کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں، مولانا عبدالماجد نہیں ہوں کہ بیٹھ جاؤں گا۔ اچھی طرح سن لیجیے کہ جب تک ایک ایک لفظ نہ کہہ لوں گا اسٹریچی ہال سے جاؤں گا اور نہ جانے دوں گا''۔ اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ بولے اور بڑے ہی دھڑلے کے ساتھ تقریر کی۔ تقریر کیا تھی ایک سحر تھا کہ کسی کو ہاتھ ہلانے کا بھی ہوش نہ تھا، ایک جوار بھاٹا تھا جس میں پتھر لڑھکنے کے بجائے موتی رول رہے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا''۔(۷)

مبارک علی خاں میرٹھی جو ۴۰ کی دہائی میں یونی ورسٹی کے طالب علم تھے، اپنی یادداشتوں میں رقم طراز ہیں: ''یہ واقعہ ۱۹۴۰ء کے آخری ایام کا ہے، مسلم یونی ورسٹی میں 'اسلامی ہفتہ' منائے جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اس کے کرتا دھرتا تھے۔ اس ہفتہ میں شرکت کے لیے مولانا مودودی بھی مدعو کیے گئے تھے۔ ہم لوگ مولانا کی تحریروں سے 'ترجمان القرآن' کے ذریعہ تین چار سال سے واقف تھے۔ یہ رسالہ دوسرے علمی و ادبی ماہناموں کے ساتھ یونین کی لائبریری میں آتا تھا اور علم دوست طلبہ اور اساتذہ کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوتا۔ ترجمان میں 'سیاسی کشمکش' کے مضامین کا سلسلہ قسط وار شروع ہوا تو اُس نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دلکش انداز تحریر اور معقول و مضبوط دلائل نے نوجوانوں کو ہی نہیں بزرگوں کو بھی متاثر کیا ہوا تھا اور ہر شخص مولانا مودودی کی آمد کی اطلاع سے مسرور اور ان سے ملاقات کا مشتاق تھا۔

''یونی ورسٹی نے جو اس زمانے میں علم و فن کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی، ایک علم دوست کی حیثیت سے مولانا مودودی کا شایان شان استقبال کیا۔ مولانا صبح کو دس بجے یونی ورسٹی کے تاریخی اسٹریچی ہال میں اپنا مشہور زمانہ مقالہ 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟' پڑھنے والے تھے، لیکن وقت مقررہ سے بہت پہلے ہی ہال اس طرح بھر گیا کہ کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ رہی۔ پروفیسر محمد حبیب (صدر شعبۂ تاریخ و سیاست) نے اس نشست کی صدارت کی۔ مولانا اپنا مقالہ

پڑھنے کھڑے ہوئے تو پورے ہال میں سناٹا چھا گیا اور مقالہ ختم ہونے تک یہی عالم رہا حالانکہ مولانا نے اس مقالے میں بغیر نام لیے مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کے طریقۂ کار پر تنقید کی تھی۔ مقالے کے بعد صدر جلسہ کی اجازت سے سوالات و جوابات کی بھرپور نشست ہوئی۔ اس زمانے میں اکثر مسلم نوجوان مسلم لیگ سے بہت متاثر تھے، خود میرا تعلق نیشنلسٹ گروپ سے تھا۔ طلبہ نے خوب خوب سوالات کیے۔ بعض نوجوانوں نے مولانا سے بڑے اچھے سولات پوچھے، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کا لہجہ کافی تلخ و تند تھا، مگر مولانا نے ان سب کا جواب جس قدر سکون، شگفتگی اور ٹھنڈے انداز سے دیا، اس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ آخر میں صدر مجلس پروفیسر محمد حبیب نے بھی مولانا سے ایک سوال کیا ''آپ پھر کب ہمیں اپنا دوسرا مقالہ سننے کا موقع دیں گے؟'' دوسرے دن انھوں نے اپنے شعبہ میں مولانا کو مدعو کیا اور اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایک لیکچر دلوایا۔

''مولانا مودودی کا قیام اولڈ بوائز لاج میں تھا۔ مجھے بھی مولانا سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا اشتیاق ہوا۔ اس زمانے میں شعبۂ ریاضی میں ایک نئے استاد پروفیسر ڈاکٹر میاں ضیاء الدین صاحب آئے تھے، ان کی وساطت سے ہم کئی طلبہ مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا کا مذکورہ مقالہ مجلس اسلامیات کی طرف سے شائع ہوکر تقسیم کیا جاچکا تھا۔ اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو سوالات ہمارے ذہن میں آئے، مولانا نے بڑے دل پسند انداز میں ان کے جواب دیے اور ہمارے شکوک وشبہات کو دُور فرمایا۔ آخر میں مولانا نے کہا ''ہر انقلاب کے لیے نوجوان ہی کام کرتے ہیں، اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ لوگ غور کریں اور اگر میری بات صحیح معلوم دے تو پھر اپنے آپ کو ذہنی اور علمی طور پر تیار کریں اور اپنی زندگیوں کو عملاً اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں''۔(۸)

۳۰ کی دہائی میں یونی ورسٹی کے طالب علم رام پور کے محمد یوسف بُھٹّہ ایک انٹرویو کے دوران کہتے ہیں: ''یہ زمانہ غالباً ۱۹۳۳ء کے آخر کا ہے جب ہم علی گڑھ پہنچے تو وہاں کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھی۔ انھی ایام میں ایک صاحب نے مجھے ''الجہاد فی الاسلام'' پڑھنے کے لیے دی۔ اس کو پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ میں اسلامی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اسی مصنف کی دوسری کتابوں کی تلاش رہنے لگی۔ پتہ چلنے پر 'ترجمان القرآن' بھی منگوانا شروع کر دیا، اور یہ سلسلہ اُس وقت سے آج تک جاری ہے''۔(۹)

پروفیسر آسی ضیائی، لاہور اپنے مضمون بعنوان ''تیری چنگاری' چراغ انجمن افروز تھی'' میں رقم طراز ہیں: ''۴۶ء میں میں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور وہاں جماعت اسلامی سے متاثر چند طلبہ اور ایک استاذ (جلیل الدین احمد خاں صاحب) سے رابطہ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں طلبہ کے 'حلقۂ ہمدردان جماعت' کا امیر بھی مجھے بنادیا گیا''۔(۱۰)

پروفیسر سید محمد سلیم، شکار پور، سندھ زمانۂ طالب علمی کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۴۴ء میں دہلی سے بی اے کرنے کے بعد میں ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے لیے علی گڑھ گیا۔ وہاں انگریزی کے استاد پروفیسر جلیل الدین احمد خاں سے ملاقات ہوئی جو وہاں جماعت اسلامی کے کارکن تھے۔ علی گڑھ میں کچھ عرصہ قبل اشتراکیت زدہ طلبہ کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں تھیں، اس لیے یونی ورسٹی کے ارباب اختیار نے طلبہ کی انجمن سازی پر سخت بندشیں عائد کر رکھی تھیں۔ طلبہ کی صرف ایک انجمن 'مجلس اسلامیات' کے نام سے قائم تھی جس کے سربراہ شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب کافی ضعیف تھے، انھوں نے نگرانی کے فرائض ڈاکٹر افضال قادری کے سپرد کر رکھے تھے۔ خود ڈاکٹر افضال صاحب بے حد مصروف آدمی تھے اس لیے انھوں نے پروفیسر جلیل الدین احمد خاں کو متعین کر دیا تھا کہ 'مجلس اسلامیات' کی نگرانی کریں۔

''پروفیسر جلیل الدین احمد خاں جونیئر لیکچرار تھے اور اپنی طویل داڑھی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ انھوں نے گویا 'مجلس اسلامیات' پر قبضہ کر لیا تھا۔ نام تو اس کا وہی رہا مگر عملاً اس کو 'حلقۂ ہمدردان جماعت اسلامی' میں تبدیل کر دیا اور راقم کو اس حلقہ کا ناظم مقرر کیا۔ ایک کلاس روم میں ہفتہ وار اجتماع ہوتا تھا، راقم درس قرآن دیتا تھا، رپورٹیں لی جاتی تھیں۔ ناظم نشر و اشاعت کتابوں کا تھیلا ساتھ لاتے تھے۔ رفقاء پڑھی ہوئی کتابیں واپس کرتے تھے اور نئی کتابیں لے جاتے تھے۔ سارا زور مطالعہ اشتراکیت کی تردید پر تھا۔

''اس حلقے میں اچھے اچھے لوگ شامل تھے۔ فروغ احمد صاحب، صفدر صدیقی صاحب، کاظم سباق، آسی ضیائی، معظم علی علوی (انگلستان) وغیرہ۔ علی گڑھ کی مشہور نمایش میں ہم نے جماعت اسلامی کی کتابوں کی بک اسٹال پہلی مرتبہ لگائی تھی۔ صفدر صدیقی ناظم نشر و اشاعت اس کے انچارج تھے۔ ایک ہفتہ میں ہم نے تین ہزار روپیہ کی کتابیں فروخت کی تھیں۔ ہمیں اس کی بڑی

خوشی ہوئی تھی، ہمارے خزانچی ہادی عطا بڑے ذہین اور محنتی طالب علم تھے، حافظ قرآن تھے، تراویح ہم نے ممتاز ہوسٹل میں ان کے پیچھے پڑھی تھیں۔ جب نتیجہ برآمد ہوا تو بی اے، بی ایس سی دونوں میں وہ سرفہرست تھے۔ مگر وائے افسوس نتیجہ نکلنے سے قبل ہی وہ فوت ہوگئے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے محدث شاہ حلیم عطا کے وہ فرزند تھے اور شاہ حسن عطا کے وہ بڑے بھائی تھے۔

''علی گڑھ میں میں نے ایم اے عربی میں داخلہ لیا۔ اس سال قمرالدین خاں نے بھی وہاں داخلہ لیا۔ دو سال تک ہم ساتھ رہے۔ قمرالدین خاں پہلے ایم اے انگریزی' علی گڑھ میں تھے، مگر بعض وجوہ کی بنا پر چھوڑ کر ڈی اے وی کالج لاہور چلے گئے۔ وہاں داخلہ لیا لیکن وہاں بھی تکمیل نہ کر سکے۔ پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں عربی کی تعلیم حاصل کی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ جماعت اسلامی کے رکن بن گئے اور پہلے ناظم تنظیم مقرر ہوئے۔ ایک کتاب کا انگریزی میں ترجمہ بھی انھی کے قلم کا ہے۔ پھر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔ میں نے جماعت اسلامی سے ان کی اور مولانا منظور نعمانی کی علیحدگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کوشش کی، مگر انھوں نے کوئی خاص بات بتا کر نہیں دی۔

''اپریل ۱۹۴۶ء میں جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجتماع الٰہ آباد میں منعقد ہوا تو 'مجلس اسلامیات' کے پندرہ طالب علموں کے ہمراہ میں نے بھی اس اجتماع میں شرکت کی''۔ (۱۱)

پدم شری حکیم سید ظل الرحمن (سابق پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ و ڈائریکٹر ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ) کے مطابق: ''میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک یونی ورسٹی کا طالب علم رہا ہوں۔ اس زمانے میں مولانا مودودی کی کتابیں طلبہ میں بہت مقبول تھیں۔ پردہ، سود، تنقیحات، تفہیمات، اور تفہیم القرآن وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ذہین اور باصلاحیت طالب علم حتیٰ کہ شیعہ اور بوہرہ طلبہ بھی مولانا مودودی کی کتابوں کو ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ شمشاد مارکیٹ میں واقع دارالمطالعہ سے میرا تعلق ۱۹۵۵ء میں قائم ہوگیا تھا۔ لائبریری عصر کے بعد کھلتی تھی، طلبہ اور اساتذہ سبھی وہاں مطالعہ کے لیے آتے تھے''۔ (۱۲)

۵۰ کی دہائی میں یونی ورسٹی کے ایک سنجیدہ طالب علم حکیم شاکر حسین عباسی (ناگپور) نے جو بوہرہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، ایک مضمون میں لکھا ہے ''یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مودودی کی

شخصیت مسلم نوجوانوں کے لیے پُرکشش تھی۔ان کا اندازِتحریر بڑا دلکش اور مؤثر ثابت ہورہا تھا اور پڑھا لکھا سنجیدہ نوجوان طبقہ ان کی طرف مائل تھا۔ مولانا کی اس وقت کی تحریروں میں اصلاحی' سماجی' اور معاشی پہلوؤں پر زور تھا اور ان کی تحریر کے ادبی انداز کو امتیاز مل رہا تھا۔(۱۳)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد علی گڑھ کے انتہائی ذہین، باصلاحیت ،غیرت مند اور دینی وملّی جذبات رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ نے پاکستان کی راہ لی ۔کیمپس میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوگیا، مگر مولانا مودودی کے فکری منہج پر چلنے والے طلبہ کی اسلامی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔شمشاد مارکیٹ کا دار المطالعہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا ۔ ۱۹۵۲ء میں فکر مودودی کے علَم بردار طلبہ یونی ورسٹی میں عددی اعتبار سے اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ طلبہ یونین کے انتخابات میں دارالمطالعہ سے وابستہ اسلامی حلقہ کے طالب علم انوار علی خاں سوز اپنے مدمقابل ترقی پسند امید وار کو شکست دے کر یونین کے سکریٹری منتخب ہوگئے۔۱۹۵۶ء میں اسی حلقے کے رکن طالب علم سید ضیاء الحسن ہاشمی (حیدرآباد) کا اسٹوڈنٹس یونین صدر اور ۱۹۵۸ء میں صغیر احمد بیدار (بھوپال) کا یونین سکریٹری منتخب ہونا،طلبہ میں مولانا مودودی کے افکار ونظریات کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

اسلامی حلقہ سے منسلک یونی ورسٹی کے متعدد ممتاز طلبہ 'علی گڑھ میگزین' کے اردو اور انگریزی شماروں کے مدیر اور اس کی مجلس ادارت کے رکن رہے۔اس زمانے میں مولانا مودودی کی تحریروں کے اقتباسات 'علی گڑھ میگزین' کی زینت بنتے تھے ۔ایم اے انگریزی کے طالب علم سید زین العابدین ۱۹۴۸ء میں 'علی گڑھ میگزین' (انگریزی) کے ایڈیٹر تھے ۔فروغ احمد صاحب 'علی گڑھ میگزین' کی مجلس ادارت میں رہے، ان کی متعدد نظمیں اور مضامین ۴۷،۴۸ء میں شائع ہوئیں ۔انوار علی خاں سوز انجمن اردوئے معلیٰ سے وابستہ تھے اور عابداللہ غازی کے ساتھ انجمن کی جانب سے دہلی کالج کے مباحثوں (Debates) میں شرکت کے لیے جاتے ۔مولانا کے دینی افکار سے متاثر ایم اے کے طالب علم انور صدیقی ۱۹۵۸ء میں 'علی گڑھ میگزین' کے ایڈیٹر رہے۔اسلامی حلقہ سے وابستہ ابن فرید اور افتخار اعظمی وغیرہ بھی اس زمانے میں یونی ورسٹی کی علمی اور ادبی فضا میں ایک روشن ستارے کی مانند چمکتے نظر آتے ہیں (مولانا کے نظریات سے متاثر اور ان کے افکار کے

علَم بردار یونی ورسٹی کے نامور طلبہ کے علمی کارناموں اور خدمات پر علیحدہ تحقیق کی ضرورت ہے)۔

● **مولانا مودودی، یونی ورسٹی اساتذہ کی نظر میں:** یونی ورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سابق صدر پروفیسر سید ضیاء احمد بدایونی نے ۱۹۶۱ء میں مولانا مودودی کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک طویل مضمون میں لکھا تھا: ''یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اہلِ قلم عموماً تین قسم کے ہیں، ایک وہ جن کے یہاں موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر فن یا اسلوب کی حقیقت ثانوی ہے جیسے حالیؔ۔ دوسرے ان کے برعکس ہیں مثلاً محمد حسین آزادؔ اور ان کے برخلاف کچھ اصحاب ایسے بھی ہیں جن کے یہاں موضوع اور اسلوب دونوں اہم ہیں جیسے شبلی۔ ہمارے خیال میں مولانا مودودی کا شمار آخر الذکر طبقے میں ہے۔ انھوں نے ہماری زبان کو نئے حیات بخش خیالات سے مالامال کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک مؤثر دلکش اسلوب بھی دیا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت جس قدر موصوف کے افکار سے متاثر ہوئی ہے، اس قدر کسی دوسرے سے نہیں ہوئی۔ اس لیے بے جا نہ ہوگا اگر ان کو دَورِ حاضر کا 'متکلمِ اسلام' کہا جائے''۔(۱۴)

شعبۂ عربی میں پروفیسر عبدالعزیز میمن کے شاگرد رشید اور کراچی یونی ورسٹی میں عربی کے استاذ ڈاکٹر سید محمد یوسف اپنے ایک مضمون بعنوان ''مولانا مودودی بحیثیت ایک ادیب'' میں رقم طراز ہیں: ''مولانا مودودی'' میرے لیے یہ دو جادو کے بول ہیں جن سے ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء کے علی گڑھ کی تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دور ہر لحاظ سے فیصلہ کُن تھا۔ علی گڑھ کو نصف صدی سے وہ حیثیت حاصل تھی جو جسم انسانی میں قلب کی ہوتی ہے۔ اس دَور میں ملت اسلامیہ ہند کا قلب اُمنگوں اور آرزوؤں سے معمور تھا۔ ہر نوجوان مستقبل کے متعلق مصروف فکر نظر آتا تھا۔ 'دانش فرنگ' کے ساتھ ساتھ 'شاہین کا تجسس' رکھتا تھا۔ کانگریس شکست کھا چکی تھی لیکن لہو گرم رکھنے کے بہانے کی حد تک باقی تھی۔ کمیونزم اپنے خلیہ یا یوں کہیے کہ بِل میں سمٹا اور دبکا پڑا تھا، مسلم لیگ کا بول بالا تھا۔ سیاسی پہلو سے قطع نظر اس کا ایک نمایاں اثر یہ تھا کہ اسلام کے مطالعہ کا شوق عام تھا۔ گپ اور مزاح بھی نظریاتی کش مکش کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ عین اس دور میں مجھے اپنے تعلیمی مراحل طے کرنے کا موقع ملا اور اسی عہد میں میرے بحر کی موجیں طوفان آشنا ہوئیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کوئی تقریر، مباحثہ اور جھڑپ ایسی نہ ہوتی تھی جس میں

مولانا مودودی کا حوالہ کسی نہ کسی پیرایہ سے نہ دیا جاتا ہو۔

''اسلامی رجحانات رکھنے والوں کے لیے مولانا مودودی کے ارشادات چراغ راہ تھے اور مخالفین بھی اس چراغ پر پھونک مارنے کے لیے مجبور تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلم لیگی بھی مسلم لیگ پر اگر کسی کے نقد اور تبصرہ کو قابل اعتنا سمجھتا تھا اور ٹھنڈے دل سے سنتا تھا تو وہ مولانا مودودی کا نقد اور تبصرہ تھا۔ الغرض ہر جماعت اور ہر محفل کی گرمی انھی کے دم سے تھی''۔(۱۵)

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی 'مولانا مودودی کی ادبی حیثیت' کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

یہاں گفتگو مولانا کی ادبی حیثیت سے ہے۔ سرسید جدید ادب کے بانی قرار دیے جاتے ہیں، مودودی صاحب کے افکار وتصورات سرسید کے ذہنی معتقدات سے کتنے ہی مختلف سہی' لیکن ان کا اسلوب سرسید کے اسلوب کی ایک ارتقا یافتہ صورت ہے۔ سرسید نے اسلام سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اُن کے دینی خیالات سے ممکن ہے کہ آپ کو اختلاف ہو، لیکن شاید یہ بات ماننے میں تامل نہ ہو کہ سرسید نے اسلام پر جس انداز سے قلم اُٹھایا، اُس نے محسن الملک، حالی، شبلی، سلیمان ندوی اور مولانا مودودی کے اسالیب کی شیرازہ بندی کی ہے۔ مختصراً اُسے یوں کہہ لیجیے کہ مولانا مودودی کی تحریر سرسید کے اسلوب کے ایک پہلو کی تکمیل کرتی ہے، لیکن وہ سرسید کے مقلدِ محض نہیں ہیں۔ اُن کے اسلوب کی بنیادِ اوّل اُن کی ذات ہے۔ شخصیت کا اظہار نہ ہو تو کوئی تحریر ادبی نہیں بن سکتی۔ شخصیت کی اسی نمود کو اقبال نے 'خونِ جگر' کہا ہے۔ ملٹن نے اسے Life Blood کہا تھا اور میر امّن نے اسے 'خونِ دل' سے تعبیر کیا تھا۔(۱۶)

پروفیسر خورشید احمد نے 'ادبیات مودودی' (مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶، اشاعت مئی ۱۹۸۰ء) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں عبدالماجد دریابادی کے علاوہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی علیگ نے بھی مولانا مودودی کے ادب اور ان کے طرز نگارش پر خط میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جو کسی وجہ سے اس مجموعہ میں شائع نہیں ہو پایا ہے۔ توقع ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان قیمتی خطوط کو لازماً شائع کیا جائے گا (مگر صد افسوس اتنی بلند پایہ عبقری شخصیات کے ایسے قیمتی علمی خطوط معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر ۶۰ برس بیت جانے کے باجود اب تک منظر عام پر نہیں آسکے یا ضائع ہوگئے ہیں)۔

● **اسٹریچی ہال میں پہلا خطاب:** مسلم یونی ورسٹی کے سالانہ 'اسلامی ہفتہ' کی تقریبات کے دوران لیکچر کے لیے 'انجمن اسلامی تاریخ وتمدن' کی دعوت پر خرابیٔ صحت کے باوجود مولانا مودودی پہلی بار علی گڑھ تشریف لائے اور ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو یونی ورسٹی کے تاریخی اسٹریچی ہال میں طلبہ اور اساتذہ کے جمِ غفیر سے خطاب کیا۔ مسلم ریاست کی ملک گیر سیاسی مہم کے تناظر میں مولانا کے مقالے کا عنوان تھا: 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'

مولانا کے طویل مقالے کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جارہا ہے: ''حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی' یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، اُن کو اپنا غلام بنائیں، اُن کے سر اپنے آگے جُھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں۔ بلکہ یہ بارِ ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرّہ برابر بھی خودغرضی' نفس پرستی' تعصب' جانب داری' اور بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں''۔(۱۷)

● **عبدالماجد دریابادی کے اخبار صدق کی رپورٹ:** ستمبر ۱۹۴۰ کے 'اسلامی ہفتہ' کے بعد یونی ورسٹی مجلس اسلامیات کے معاون معتمد جناب محمد اللہ انصاری کی رپورٹ جو ''مسلم یونی ورسٹی میں اسلام کی نشاتِ ثانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی: ''علی گڑھ میں ایک خالص اسلامی فضا کی تشکیل کے لیے جو مساعی یہاں کے اسلامی جوش رکھنے والے حضرات اساتذہ اور طلبہ کی جانب سے ۱۹۳۳ء سے عمل میں لائی جارہی ہے' ان کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اکابر علماء دین کو یہاں تشریف آوری کی تکلیف دی جاتی ہے تاکہ وہ ہمارے دینی اور ملی مسائل کی گتھیوں کو سلجھا کر ہم کو اسلام کی نشاتِ ثانیہ کی جانب دعوت دیں۔ اس سال ہم کو اس باب میں جو کامیابی ہوئی ہے اس پر ہم جس قدر مسرور ہوں کم ہے۔ ماہ ستمبر میں 'اسلامی ہفتہ' کے سلسلے میں متعدد علماء کرام تشریف لائے۔ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے 'اسلامی نظام حکومت' پر اپنے بصیرت افروز مقالے سے

نیز پرائیویٹ صحبتوں میں اپنے بیش قیمت افکار سے ہم کو مستفید فرمایا اور ہم میں ایک نئی روح پھونکی''۔(۱۸)

عبدالرحمٰن عبد اپنی تصنیف 'مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی' میں رقم طراز ہیں: ''مولانا نے ۱۲ستمبر ۱۹۴۰ءکو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''وہ قومی حکومت جس پر 'اسلامی' کا نمایشی لیبل لگا ہوا ہوگا' اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے' وہ مسلم قومی حکومت اُن پر سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمت اللہ علیہ ہی رہیں گے''۔مولانا نے اگلے سال اسی جگہ اسٹریچی ہال میں 'انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل' کے عنوان سے خطاب کیا۔(۱۹)

● **پروفیسر محمد حبیب کے مکان پر قیام:** شعبہ تاریخ وسیاسیات کے صدر پروفیسر محمد حبیب [۱۸۹۵ء-۱۹۷۱ء] کے فرزند اور شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ایمیریٹس عرفان حبیب نے اپنی رہایش گاہ پر گفتگو کرتے ہوئے مجھے بتایا: ''مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں چھوٹا تھا اور اسکول جاتا تھا تو ایک روز مولانا مودودی ہمارے گھر تشریف لائے تھے اور شب میں قیام کیا تھا۔ مولانا کے قیام کے سلسلے میں میرے والدین کے درمیان اختلاف ہوا تھا، والدہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ مولانا ہمارے گھر قیام کریں، مگر والد صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں، وہ ہمارے مہمان ہیں''۔(۲۰)

● **شعبہ تاریخ و سیاسیات میں خطاب:** ۴۰ کی دہائی میں یونی ورسٹی کے طالب علم مبارک علی خاں میرٹھی نے ہفت روزہ 'دعوت' کے کالم 'کچھ یادیں کچھ باتیں' کے تحت اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اسلامی ہفتہ کی تقریبات کے دوران اسٹریچی ہال میں مولانا کے پہلے خطاب کے بعد صدر مجلس پروفیسر محمد حبیب جیسا صاحب علم اور دانشور استاد مولانا مودودی کے علم کی پختگی اور گہرائی سے اس قدر متاثر ہوا کہ دوسرے دن انھوں نے اپنے شعبہ میں مولانا کو مدعو کیا اور 'اسلام کے نظریۂ سیاسی' پر ایک لیکچر دلوایا۔(۲۱)

● **اسٹریچی ہال میں دوسرا خطاب:** مولانا مودودی 'انجمن تاریخ وتمدن اسلامی' کی دعوت پر 'اسلامی ہفتہ' کی تقریبات میں شرکت کے لیے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں دوبارہ علی گڑھ تشریف

لائے اور اسٹریچی ہال میں طلبہ سے دوسری بار خطاب کرتے ہوئے اپنا مقالہ بعنوان ''انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل'' پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''انسان کے معاشی مسئلے کو سمجھنے اور صحیح طور پر حل کرنے میں جو مشکل پیش آرہی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس مسئلے کو بعض لوگ صرف معاشیات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بعض اس کی اہمیت میں مبالغہ کرکے اسے کُل مسئلہ زندگی قرار دے رہے ہیں اور بعض اس سے بھی تجاوز کرکے زندگی کا بنیادی فلسفہ اور اخلاق اور تمدن و معاشرت کا سارا نظام معاشی بنیاد ہی پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر معاشیات ہی کو اساس ٹھیرایا جائے تو انسان کا مقصدِ زندگی اُس بیل کے مقصدِ زندگی سے کچھ بھی مختلف نہیں ٹھیرتا، جس کی تمام سعی و جہد کی غایت یہ ہے کہ ہری ہری گھاس کھا کر خوش و خرم اور تنومند ہوجائے اور کائنات میں اس کی یہ حیثیت قرار پاتی ہے کہ وہ بس چراگاہِ عالم میں ایک آزاد چرندہ ہے۔

''قدیم ترین زمانے میں انسان کے لیے معاش کا مسئلہ قریب قریب اتنا ہی سہل تھا، جتنا حیوانات کے لیے ہے۔ خدا کی زمین پر بے شمار سامانِ زندگی پھیلا ہوا ہے۔ ہر مخلوق کے لیے جس قدر رزق کی ضرورت ہے وہ بافراط مہیا ہے۔ ہر ایک اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے نکلتا ہے اور جا کر خزائن رزق میں سے حاصل کرلیتا ہے۔ کسی کو نہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ اس کا رزق کسی دوسری مخلوق کے قبضے میں ہے۔ تقریباً یہی حالت انسان کی بھی تھی کہ گیا اور قدرتی رزق خواہ وہ پھلوں کی شکل میں ہو یا شکار کے جانور کی شکل میں، حاصل کرلیا۔ قدرتی پیداوار سے بدن ڈھانکنے کا انتظام کرلیا، زمین میں جہاں موقع دیکھا ایک سر چھپانے اور پڑ رہنے کی جگہ بنالی۔ لیکن خدا نے انسان کو اس لیے نہیں پیدا کیا تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اسی حال میں رہے۔ اس نے انسان کے اندر ایسے فطری داعیات رکھے تھے کہ وہ انفرادی زندگی چھوڑ کر اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اپنی صنعت سے اپنے لیے ان ذرائع زندگی سے بہتر ذرائع پیدا کرلے جو قدرت نے مہیّا کیے تھے''۔(۲۲)

یونی ورسٹی میں ابوالاعلیٰ مودودی کے دوروں اور طلبہ سے ملاقاتوں کے سبب صالح فکر کے ذہین طلبہ کی ایک قابل ذکر تعداد اُن کے قریب ہوگئی تھی۔ انھوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی ہر پہلو سے ہمہ گیر تربیت کی۔

۴۰ کی دہائی میں یونی ورسٹی میں 'اسلامی حلقہ' سے متعلق معروف اور سرگرم طلبہ میں افضل حسین

(قیم جماعت اسلامی ہند)،عبدالعظیم خاں، راؤ شمشادعلی خاں (دہلی)، آسی ضیائی (پاکستان) عبداللہ صفدرعلی (دہلی)،شمس الہدیٰ (بہار)، سید حسین (الٰہ آباد)،سعید احمد (الٰہ آباد)،فروغ احمد (ڈھاکہ)، احمد سورتی (علی گڑھ)، رحمت اللہ شاہ (بہاولپور، پاکستان)، اعجاز حسن قریشی (لاہور) اور سید زین العابدین (سعودی عرب) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔(۲۳)

● **اہلِ علی گڑھ کی تصنیفات پر نقد و تبصرہ:** ۱۹۴۰ء میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کی تصنیف 'خلافت وسلطنت' منظر عام پر آئی تو مولانا نے اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''یہ اس مقالے کا اردو ترجمہ ہے جو مؤلف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے لندن یونی ورسٹی میں پیش کیا تھا۔موضوع بلاشبہ دلچسپ ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھا تاریخی مواد فراہم کیا ہے،لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس مواد پر بحث کا جو انداز انھوں نے اختیار کیا ہے وہ اہل یورپ کے تاریخی ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔اسلام اور اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کی بحث نہ صرف ناقص ہے بلکہ مسائل کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔اگر وہ مغربی مذاق کے بجائے اسلامی مذاق کی رعایت کرتے تو پہلے خلافت کے معنی ومفہوم کو متعین کرتے، پھر واضح طور پر یہ بتاتے کہ عباسیوں نے پاپائی اور قیصریت کے جس مجموعے پر لفظ 'خلافت' کا اطلاق کیا تھا وہ حقیقی اسلامی خلافت سے کس قدر مختلف تھا''۔(۲۴)

۱۹۴۰ء میں پروفیسر محمد حبیب (صدر شعبۂ تاریخ وسیاست) کی آل انڈیا ریڈیو کے لیے کی گئی تقریروں کا مجموعہ 'دنیا کی کہانی' جب مکتبہ جامعہ، دہلی سے شائع ہوا،تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''نوجوان طلبہ کو تاریخ وتمدن سے آگاہ کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ مجموعہ ہے۔اسلام کی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ ''اسلام نے دولت کو امانت قرار دیا ہے اور جماعت جب چاہے اس دولت کو واپس لے سکتی ہے، یا اسے نئے سرے سے تقسیم کرسکتی ہے''۔اسی طرح انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جماعت جب چاہے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت کرسکتی ہے''۔اور یہ کہ ''ہندوستان میں پردے کی جو رسم قائم ہوئی اس کے لیے اسلامی قانون میں کوئی سند نہیں''۔یہ سب بیانات غیر صحیح ہیں۔ایک محقق سے

ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جن امور کے متعلق اس کے پاس ذرائع معلومات نہ ہوں ان پر قطعی رائے ظاہر کرنے سے وہ اجتناب کرے گا''۔(۲۵)

۱۹۳۷ء میں شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر سید ظفرالحسن کا رسالہ 'نبوت اور نبی' منظر عام پر آیا، تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا: ''یہ وہ خطبہ ہے جو ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب استاد فلسفہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے 'یوم النبیؐ' کی تقریب پر یونی ورسٹی کی مجلس اسلامیہ کے سامنے پڑھا تھا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ ہماری یونی ورسٹی میں جو شخص فلسفہ کا پروفیسر ہے وہ ایک سچا اور صحیح العقیدہ مسلمان ہے، اور اپنے علم کو دہریت و الحاد کے بجائے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے اس خطبہ کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ مجلس اسلامیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے غالباً مفت مل سکے گا''۔ ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی کی خط کتابت اور ذاتی مراسم کا سراغ ملتا ہے۔(۲۶)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق طالب علم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی پی ایچ ڈی کا مقالہ جب 'مجدد الف ثانی کا تصور توحید' کے نام سے کشمیری بازار لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر نقد کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تصنیف کی گئی اس تحریر کی بعض خامیوں اور غلطیوں پر گرفت کی اور صاحب کتاب کے سرسید احمد خاں اور حافظ محمد عبداللہ چکڑالوی کے متعلق نوٹ پر سخت تبصرہ کیا۔(۲۷)

جب ۱۹۴۴ء میں جناب محمد فضل الرحمٰن انصاری کی انگریزی تصنیف Our Future Educational Program کے نام سے شائع ہوئی، تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے 'ترجمان القرآن' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''یہ انگریزی کتاب مسلمانوں کی تعلیم کے پیچیدہ اور اہم ترین مسئلہ سے بحث کرتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے مسلمانوں کے لیے 'غیر مسلم تعلیم' کے بجائے 'مسلمان تعلیم' کا پروگرام تجویز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی نقطہ کی اہمیت کو موصوف نے اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کو 'مذہبی' اور 'غیر مذہبی' دو حصوں میں تقسیم کرنا اور مروجہ نصاب کے ساتھ دینیات کے مضمون کو بطور ضمیمہ شامل کر دینا نہ صرف یہ کہ غیر مفید ہے،

بلکہ اُلٹا مضر ہے۔ اس طریق کار کی جگہ یہ کتاب پورے نظام تعلیم کو 'مسلمان' بنانے کے حق میں ہے، یعنی اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زبان دانی' ریاضی' تاریخ' جغرافیہ' سائنس' فلسفہ اور تمام مضامین کو 'دینیات' بن کر رہنا چاہیے۔ اس اصول کی بنیاد پر نصاب کا جو تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ اگرچہ بسا غنیمت ہے مگر اس میں اختلاف کی گنجایش تو بہرحال ہے ہی''۔(۲۸)

انجمن اسلامی تاریخ وتمدن مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۴۱ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف 'اسلامی تمدن کی کہانی اسی کی زبانی' شائع کی تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے 'ترجمان القرآن' میں اس پر تبصرہ کیا: ''جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس مقالے میں 'تمدن اسلام کی کہانی خود اسی کی زبانی' سنوائی گئی ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مختلف انبیاء کے دَور میں جس طرح اسلام اور جاہلیت کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں جس طرح اسلام اپنے آپ کو نمایاں کرتا رہا، پہلے اسے قصہ وداستان کے پیرائے میں مختصراً بیان کیا گیا ہے، پھر اسی پیرایۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے تمدن اسلام کے مختلف اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، معاشی پہلوؤں کو جاہلیت کے مظاہر سے ممیز کر کے دکھایا گیا ہے۔ کسی موضوع پر مفصل تحقیقی بحث تو ظاہر ہے کہ اس طرز بیان میں نہیں کی جاسکتی تھی، لیکن ایک طالب حق کے لیے ضلالتوں کے مقابلہ میں ہدایت کے آثار وعلائم کی نشان دہی فاضل مقالہ نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ ایک دو مقام نگاہ سے ایسے بھی گزرے جہاں مصنف کا قلم راست روی سے ہٹ گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ خلیفہ اسلام کے لیے 'ڈکٹیٹر' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو بالکل ہی نامناسب ہے اور ایک دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی قلمرو میں پوری پوری 'شاہنشاہیاں' داخل تھیں، حالاں کہ اسلام کی قلمرو میں انسان کی شہنشاہی تو درکنار شاہی تک کے لیے گنجایش نہیں ہے۔ یہ اگرچہ محض تعبیری لغزشیں ہیں، لیکن ناواقف لوگوں کو بڑی غلط فہمیوں میں ڈال سکتی ہیں، اس لیے بہتر ہو کہ آیندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کردی جائے''۔(۲۹)

۳۲ صفحات پر مشتمل مولانا سید سلیمان ندوی کا رسالہ بعنوان 'ایمان' ۱۹۴۱ء میں انجمن اسلامی تاریخ وتمدن مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہوا، تو مولانا مودودی نے اس پر بھی ایک جامع تبصرہ کیا: ''یہ مقالہ انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کی دعوت پر علی گڑھ میں پڑھا گیا۔ اس میں مولانا نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ جماعتوں، قوموں اور ملتوں کا عروج وارتقاء دراصل

کسی عقیدے یا تخیل پر ایمان کا رہین منت ہوتا ہے۔ اسی ایمان پر ان کی پوری زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اسی کے استحکام پر ان کی تعمیر حیات کا استحکام موقوف ہوتا ہے اور اسی کے ضعف سے ان کے نظام ہستی کی بندشیں ڈھیلی ہوجاتی ہیں۔ آگے چل کر مولانا نے مختلف قوموں اور ملتوں کے اساسی عقائد کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اسلامی عقائد کے سوا اور کوئی دوسرا عقیدہ ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی عالمگیر اور صالح نظام تمدن کی بنیاد قائم ہوسکتی ہو۔ درحقیقت یہ پورا مقالہ اس لائق ہے کہ اس کا نہایت غور سے مطالعہ کیا جائے۔

''آغاز میں مولانا محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تقریظ میں یہ تمنا ظاہر کی گئی ہے کہ خدائے برتر 'ہماری یونی ورسٹی کے کارآمد اور کارکن اجزا و اعضاء کو اس مقدس پیغام کا علماً حامل، عملاً قابل اور قولاً سچا داعی بنادے'۔ بہتر ہوتا کہ صاحب تقریظ اس مقدس تمنا کا اظہار کرنے کے ساتھ اپنے مخاطب نوجوانوں کو اس تلخ حقیقت پر بھی متنبہ فرمادیتے کہ اگر کہیں واقعی یہ حرکت کرنے پر تم آمادہ ہوگئے تو سب سے پہلے وہی لوگ تمھیں فتنہ ثابت کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے جو یہ بیش قیمت مقالہ تمھیں سنایا کرتے ہیں۔ عافیت چاہتے ہو تو ان مقالوں کو سنو اور صرف اسلام کی نظری کرامات پر سر دُھن کر اپنے اُنھی کاموں میں لگ جاؤ جو دنیا میں ہو رہے ہیں''۔(۳۰)

● **پروفیسر حیدر خان کے توسیعی لیکچر کا تنقیدی جائزہ:** جنوری ۱۹۳۷ء میں انگریزی روزنامہ دی اسٹیٹس مین میں مذہب کے موضوع پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ کیمیا میں استاد پروفیسر حیدر خان کے ایک توسیعی خطبہ (Extention Lecture) کا متن شائع ہوا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے ایک طویل مضمون میں لکھا: ''آپ کیمسٹری کے معلم ہیں اور مذہب پر کلام فرما رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان سے دریافت کیجیے کہ آپ نے مذہب کا کتنا مطالعہ فرمایا ہے؟ کون کون سی کتابیں ملاحظہ کی ہیں؟ کتنا وقت مذہبی مسائل پر غور وخوض کرنے میں صرف کیا ہے؟ اگر ان کے اخلاق (جنت و دوزخ والے نہیں بلکہ ترقی پذیر اخلاق) میں صداقت کوئی چیز ہے تو وہ خود ہی اس بات کا اعتراف کرلیں گے جو ہم نے ان کا خطبہ پڑھ کر اخذ کی ہے۔ یعنی یہ کہ انھوں نے مذہب کا کچھ بھی مطالعہ نہیں کیا، صرف چند ایسے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں جو بعض مغربی مصنّفین نے زیادہ تر عیسائی مذہب کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں، اور

اس خارجی و سرسری مطالعہ پر بھی تفکر اور محققانہ غور و خوض کے لیے ان کو کچھ زیادہ وقت نہیں ملا ہے۔ اس کے بعد کس نے کہا تھا کہ آپ مذہب پر اظہار رائے فرمائیں؟ کیا ایک ریشنلسٹ کا یہی کام ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر اظہار خیال کرے، جس پر اس نے کافی مطالعہ اور کافی غور و خوض نہ کیا ہو؟'' (۳۱)

● **یونی ورسٹی کانو وکیشن میں لارڈ لوتھین کے خطبہ پر تبصرہ**: جنوری ۱۹۳۸ کے آخری ہفتے میں علی گڑھ مسلم یونیوسٹی کے کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) کے موقعے پر اوکسفرڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، Round Table جیسے مشہور رسالے کے ایڈیٹر اور تقریباً ۲۲ سال سے حکومت برطانیہ کے اعلیٰ سفارتی عہدوں پر فائز معروف برطانوی صحافی، سیاست دان اور سفیر لارڈ لوتھین (۱۸۸۲ء-۱۹۴۰) کے عالمانہ اور حقیقت پسندانہ خطاب پر مولانا مودودی نے 'دورِ جدید کا اہم ترین مسئلہ مذہب کی ضرورت اور اس کا معیار' کے عنوان سے ایک مبسوط علمی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''لارڈ لوتھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ جدید اور قدیم دونوں اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبے میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے، جس نے علوم جدیدہ اور ان کی پیدا کردہ تہذیب کو محض دور سے نہیں دیکھا ہے، بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں جنم لیا ہے، اور اپنی زندگی کے ۵۶ سال اسی سمندر کی غواصی میں گزارے ہیں۔ وہ پیدایشی اور خاندانی پورپین ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے اور ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس کے گھر میں اصل خرابیاں کیا ہیں۔

''ایک حیثیت سے یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے، کیونکہ اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور ان کی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا، وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ ''خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا، یہ ہمیں تباہی کے کنارے پر پہنچا چکی ہے اور تمھیں بھی تباہ کر کے رہے گی۔ ہم خود اس وقت تریاق خالص کے محتاج ہیں، اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور ہوتا ہے کہ وہ تریاق تمھارے پاس موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر ہماری اس زہر آلود معجون کے مزے پر لگ جاؤ''۔ (۳۲)

●یونی ورسٹی کورٹ کو تعلیمی نظام کے سلسلے میں مشورے: مسلم یونی ورسٹی کورٹ نے اپریل ۱۹۳۶ء میں جب اپنے سالانہ اجلاس میں یونی ورسٹی میں دینیات اور علوم اسلامیہ کے ناقص طرزِ تعلیم کی اصلاح اور یونی ورسٹی کے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کے اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی تو ابوالاعلیٰ مودودی نے حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' میں 'ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص' کے عنوان سے ایک مدلل علمی مضمون لکھ کر تعلیمی نظام کی تدوین کے سلسلے میں اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کیا اور یونی ورسٹی کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا: ''ایک مستقل قومی یونی ورسٹی قائم کرنے کا تخیل جس بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ 'مسلمان' بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونی ورسٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی اپنی یونی ورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے، اگر وہاں سے بھی ویسے ہی گریجویٹ نکلیں جیسے سرکاری یونی ورسٹیوں سے نکلتے ہیں اور وہاں بھی دیسی لوگ یا ہندی وطن پرست یا اشتراکی ملاحدہ ہی پیدا ہوں تو لاکھوں روپے کے صرف سے ایک یونی ورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کون سی خاص ضرورت ہے؟

''یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی۔ جب یونی ورسٹی قائم کی جارہی تھی، اس وقت سب سے پہلے اسی بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک علیحدہ یونی ورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے، مگر کسی نقاد نے آج کل کے مسلمانوں کی تعریف میں شاید سچ ہی کہا ہے کہ یہ کام پہلے کرتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔ جن لوگوں کو یونی ورسٹی بنانے کی دھن تھی انھیں بس یونی ورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی، اس کا کوئی نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیش نظر ہی نہ تھا کہ ایک مسلم یونی ورسٹی کیسی ہونی چاہیے اور کن خصوصیات کی بنا پر کسی یونی ورسٹی کو ''مسلم یونیورسٹی'' کہا جاسکتا ہے۔ اس عمل بلافکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ویسی ہی ایک یونی ورسٹی علی گڑھ میں بھی قائم ہوگئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری لکھنؤ اور تیسری ڈھاکہ میں ہے''۔ (۳۳)

● **مجلس اصلاح نصاب دینیات کو تجاویز:** اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم یونی ورسٹی کورٹ کی توجہ اور فکرمندی کے بعد مسلم یونی ورسٹی کی 'مجلس اصلاح نصاب دینیات' نے ملک بھر کے جید علما، دانشوروں اور ماہرین تعلیم سے یونی ورسٹی میں دینیات اور علوم اسلامیہ کے طریقۂ تعلیم اور طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کے ضمن میں منصوبہ بندی کے لیے تجاویز طلب کی تھیں۔

اس موقعے پر ابوالاعلیٰ مودودی نے سوالات کے جواب میں اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیمی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے 'مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل' کے عنوان سے ایک جوابی تحریر ارسال کی جو ۱۹۵۷ء میں 'تعلیمات' کے نام سے منظرعام پر آئی۔ مولانا نے اس میں لکھا تھا: ''اس وقت مسلم یونی ورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یک جائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متبائن اور متزاحم عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا''۔ (۳۴)

● **مسلم یونی ورسٹی پریس سے مولانا کے مقالے کی اشاعت:** دسمبر ۱۹۳۹ء میں ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' کے عنوان سے ماہنامہ 'ترجمان القرآن' لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مقالے کی مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ میں مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں مسلم یونی ورسٹی میں سرگرم 'آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن' نے اپنے سہ ماہی انگریزی رسالے The Awakening کے پہلے شمارے میں ۳۵ صفحات پر مشتمل مقالے کا انگریزی ترجمہ The Islamic Conception of State کے عنوان سے شائع کیا۔ مذکورہ بالا سہ ماہی رسالہ مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ سے جنوری ۱۹۴۰ء میں ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں مذکورہ مضمون ۱۴ر جنوری ۱۹۴۰ء کو مسلم یونی ورسٹی پریس سے ۲۰۰۰ کی تعداد میں

علیحدہ شائع ہوا، جس کے نسخے قائداعظم پیپرز سیل وزارت ثقافت، اسلام آباد پاکستان میں نمبر ۵۹۷ اور نمبر ۹۵۲ پر محفوظ ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل یہ رسالہ اردو میں دس ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے انگریزی کے علاوہ عربی، بنگالی، انڈونیشی، ملائی اور سندھی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔(۳۵)

● **انگریزی ترجمہ پر صدق لکھنو کا تبصرہ:** ۳۲ صفحات پر مشتمل 'اسلام کا نظریۂ سیاسی' کا انگریزی ترجمہ جب 'اسلامک کنسیپشن آف اسٹیٹ' کے نام سے دفتر رسالہ 'ترجمان القرآن'، لاہور سے شائع ہوا، تو 'صدق' لکھنؤ کے مدیر مولانا دریابادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''اسلام کے نظریۂ حکومت'' کے عنوان سے مولانا مودودی نے کچھ عرصہ ہوا ایک خطبہ لاہور کی ایک جامع مسجد میں ارشاد فرمایا تھا۔ بعد کو وہ ان کے رسالہ 'ترجمان القرآن' میں چھپا اور اب یہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ مولانا کے مبصرانہ ومحققانہ خیالات اس باب میں معلوم ومعروف ہیں۔ بہ سبیل ایجاز جتنی اصولی بحثیں اتنی ضخامت میں آسکتی تھیں، سب اس رسالہ میں موجود ہیں اور مقالہ کہیں سے تشنہ نہیں معلوم ہوتا۔ ترجمہ کی زبان بھی بہت غنیمت ہے، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر جگہ محض اسم مبارک محمدؐ لاتے رہنا مترجم صاحب کا ایک غلط اجتہاد اور مسیحی اہل قلم کی بے معنی تقلید ہے۔ اسی طرح حاشیہ میں رسول کا ترجمہ جو 'پرافٹ' فرض کیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ پرافٹ لفظ نبی کا ترجمہ ہے، رسول کے لیے معروف ومتداول لفظ Messenger ہے۔ پکتھال مرحوم نے اسی آخری لفظ کو چلایا ہے''۔(۳۶)

● **یونین ہال میں تعزیتی جلسہ:** ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکا کے شہر بفیلو میں مولانا مودودی کے انتقال کی خبر علی گڑھ پہنچی تو مسلم یونی ورسٹی کے ہاسٹلوں کی مساجد میں ۲۳ ستمبر کو نمازِ فجر کے بعد طلبہ نے اشکبار آنکھوں سے اس اندوہناک سانحہ کی خبر سنی۔ یونی ورسٹی پر ایک ماتمی فضا چھا گئی اور جامع مسجد میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ۲۶ ستمبر کو بعد نماز مغرب تاریخی طلبہ یونین ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت یونی ورسٹی ناظم دینیات پروفیسر مولانا محمد تقی امینی [۵ مئی ۱۹۲۶ء- ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ء] نے کی۔ یونین ہال طلبہ واساتذہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، عرب اور ایرانی طلبہ بھی موجود تھے۔

یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر جناب جاوید حبیب نے فرمایا'' مولانا مودودی نے

حاکمیت الٰہ کی بات اس وقت کی جب عام مسلمان تو کیا بڑے بڑے عالم دین' اسلام کے اس بنیادی عقیدے کو پیش کرنے سے کتراتے تھے۔ مولانا کی جہد مسلسل کو اللہ تعالیٰ نے ایسا نوازا ہے کہ اب ایک ملک میں نہیں بلکہ متعدد ممالک میں اسلامی حکومت کی بات ہو رہی ہے''۔ عرب اور ایرانی طلبہ کے نمایندوں نے بتایا کہ ''مولانا کی تحریروں نے انھیں اسلام کی سمجھ اور انقلابی جذبہ دیا ہے''۔

یونی ورسٹی ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا: ''مولانا مودودی کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نئی نسل کے ذہن کو سمجھا اور اس کے مطابق اسلام کو نئے اسلوب میں پیش کیا۔ نماز، روزہ جیسی روزمرہ کی چیزوں کو دلفریب حسن اور گہری معنویت بخشی۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور علمی کوششوں سے مغربی مادیت اور کمیونسٹ الحاد کی جھلسا دینے والی آندھیوں سے ٹکر لے کر اسلام کی ٹھنڈی ہوا چلائی۔'' (۳۷)

مولانا مودودی کے جنازے میں شرکت کے لیے ایم اے فلسفہ کے طالب علم مسٹر مقیم الدین اور بی یو ایم ایس کے محمود احمد راتھر ۲۴ ستمبر کو پاکستان روانہ ہوئے اور ۲۵ ستمبر کو یہ لوگ مولانا کی تدفین میں شریک ہوئے۔ پاکستان سے واپسی کے بعد محمود احمد راتھر صاحب نے مولانا مودودی کے جنازہ اور تجہیز و تکفین کا آنکھوں دیکھا حال اپنے ایک مضمون میں بیان کیا جو پندرہ روزہ 'ہمقدم'، علی گڑھ کی نومبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں موجود ہے۔

● **نواب چھتاری کی مجلس میں:** مولانا مودودی کی علمی بلندی اور عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سرپرست نواب حافظ احمد سعید خاں چھتاری [۱۸۸۸-۱۹۸۲ء] کی ایما پر اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی تدوین اور اصولوں کی ترتیب کے لیے انھی کی صدارت میں بنائی گئی مجلس کا پہلا اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عباسیہ ہال میں جنوری ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ عبدالماجد دریابادی، شبیر احمد عثمانی، مولانا آزاد سبحانی، عبدالحامد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید سلیمان ندوی جیسی بلند ترین شخصیات کے درمیان مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس مجلس کے کم سن ترین رکن تھے اور عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے علاوہ مولانا مودودی نے بھی اپنے خیالات تحریر فرمائے تھے۔ (۳۸)

● **صدق، لکھنو کی رپورٹ:** ''اسلامی نظام حکومت پر ایک مبسوط تالیف تیار کرنے کی

تجویز 'صدق' کے متعدد نمبروں میں آچکی ہے۔ شکر خدا کہ نام کے اسلامی اداروں میں سے مسلم لیگ کی عملی توجہ اس جانب ہوئی اور صوبہ متحدہ کی مسلم لیگ کی تحریک پر ایک مستقل مجلس اس غرض ومقصد کے لیے مرتب پا گئی۔ ابتدائی مجلس شوریٰ کی نشستیں ۴ و ۵ جنوری کو دار العلوم ندوہ (لکھنؤ) کی عمارت میں ہوئیں۔ اس میں مسلم لیگ کے نامی کارکنوں مثلاً چودھری خلیق الزماں اور نواب محمد اسماعیل خاں' مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی' جمال میاں فرنگی محلی' اور قوم کے بعض نامور رئیسوں مثلاً نواب صاحب چھتاری کے پہلو بہ پہلو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی شرکت فرمائی۔ ردوقدح کے بعد یہ طے پایا کہ نظام اسلامی پر ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جس میں سیاسیات، معاشیات ومعاشرت سے متعلق مکمل تعلیمات آجائیں۔ اور اس غرض کے لیے ایک کمیٹی مصنفین کی بنادی گئی ہے جس کے داعی یا ناظم مولانا سید سلیمان صاحب منتخب ہوئے ہیں اور توقع ہے کہ ان کی اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کی مشترک نگرانی میں جو کام ہوگا وہ تحقیق اور ذمہ داری کے اعلیٰ معیار پر ہوگا۔ امید قوی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کو علماء میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حکیم عبد الرؤف دانا پوری، اور جدید طبقہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن (استاذ فلسفہ مسلم یونی ورسٹی) اور ملک کے دوسرے جلیل القدر فاضلوں کا تعاون واشتراک عمل ان شاءاللہ حاصل ہوگا''۔(۳۹)

● **سرسیّد کا تذکرہ:** ۱۹۳۶ء میں جب علماء کے ایک حلقے کی جانب سے مولانا شبلی نعمانی [۴ جون ۱۸۵۷ء- ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء] اور علامہ حمید الدین فراہی [۱۸ نومبر ۱۸۶۳ء-۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء] کے سلسلے میں تکفیر کا فتویٰ جاری ہوا تو مولانا مودودی نے ان کی حمایت میں لکھا۔ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے ساتھ سرسید اور ان کے رفقاء کا بھی دفاع کیا: ''ہزاروں مسلمانوں کو بیک جنبش قلم کافر بنا دینا کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے جس میں کسی احتیاط اور تأمل کی ضرورت ہو، اور جس کی تحقیق میں چند ساعتوں کی محنت بھی گوارا کرنا ضروری ہو۔ یہ معاملہ ایک دو کے ساتھ نہیں بیسیوں اکابر اسلام کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ مولانا اسماعیل شہید اور ان کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کو اسی طرح کافر بنایا گیا۔ مولانا محمد قاسم کی تحریروں میں بڑی محنت اور تکلف سے کفر کو تلاش کیا گیا اور نہ صرف انھیں بلکہ پوری جماعت دیوبند کو نعمت ایمان سے محروم کر دیا گیا۔ سید احمد خاں، محسن الملک

اور حالی اور ان کی پوری جماعت کا رشتہ اسی طرح امت مسلمہ سے قطع کر ڈالا گیا''۔(۴۰)

مسلمانانِ ہند کی فکری و عملی زندگی پر مغربی علوم اور انگریزی تمدن و تہذیب کے غلبے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے: ''اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرتے، چنانچہ مرحوم سرسید احمد خان کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصل طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے، قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلمی کے کام آئے اور خوش حال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں''۔(۴۱)

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اسلامیات کے پروفیسر مولانا اسلم جیراج پوری [۲۷ جنوری ۱۸۸۲ء-۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء] کی تصنیف تعلیمات القرآن جب منظرِ عام پر آئی تو مولانا مودودی نے اس پر اپنے طویل قسط وار تبصرہ کے دوران سرسید اور ان کے متبعین پر بھی نقد کیا: ''پرانے زمانے کے علماء یہ غلطی کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو انھوں نے قدیم فلسفہ اور ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس زمانے کے بندگانِ عقل کو مطمئن کرنے کے لیے قرآن کو ارسطو اور افلاطون اور بطلیموس کے نظریات پر منطبق کر ڈالا۔لیکن موجودہ دور کے نظری اور تجربی علوم نے جب پچھلے نظریات کو باطل کر دیا تو وہ تمام تاویلیں جو پہلے کی گئی تھیں، غلط ثابت ہوئیں اور وہ تمام سہارے ٹوٹ گئے جن پر قرآن مجید کی تاویل کا مدار رکھا گیا تھا۔ پھر سرسید احمد خانی دور میں دوبارہ اسی غلطی کا اعادہ کیا گیا، مگر سائنس کی جدید ترقیات نے ان سہاروں میں سے بھی بہتوں کو توڑ دیا جن پر سید مرحوم اور ان کے متبعین نے تاویل کی عمارت قائم کی تھی''۔(۴۲)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق طالب علم ڈاکٹر برہان فاروقی کی پی ایچ ڈی کا مقالہ جب 'مجدد الف ثانی کا تصورِ توحید' کے نام سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تو مولانا نے انگریزی زبان کی اس تصنیف کی بعض خامیوں اور غلطیوں پر گرفت کرتے ہوئے سرسید پر بھی تبصرہ کیا: ''اول تو ان دونوں حضرات (سرسید اور مولوی عبداللہ چکڑالوی) کا ذکر مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ اسماعیل شہید، اور سید احمد بریلوی کے سلسلے میں لانا یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ گویا یہ بھی اسی سلسلے کے آدمی ہیں، پھر سرسید کے کام کو اصلاح اور تنقید عالی کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ ''مسلمانوں میں ان کے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی اور تعلیمی تحریکیں اٹھیں ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح ان سے ملتا ہے'' دراصل وہ مبالغہ کی حد سے بھی متجاوز ہے۔ علی گڑھ کے تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ سرسید سے کتنی ہی ارادت ہو مگر جب وہ ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں تو انھیں بے لاگ حق کا اظہار کرنا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہیں ان کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سرزمین میں تجدّد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے''۔(۴۳)

سرسید احمد خاں پر مولانا مودودی کے بعض تند و تیز تبصرے گو بادی النظر میں آج متعدد اہل علم کو نامناسب اور جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی علت کو سمجھنے کے لیے بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے سماجی، معاشرتی اور مذہبی احوال و کوائف نیز طبقہ علما اور مسلمانوں کے سوادِاعظم کے ذہنی، فکری، دینی اور مذہبی شعور کی سطح کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ عمر کے ابتدائی زمانے میں سرسید پر مولانا کی تنقیدوں کے پس منظر میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ابتدائی نسلوں کی مغرب پرستی، انگریزی تہذیب و تمدن سے والہانہ رغبت اور دینی شعائر سے لاپروائی کی عمومی روش صاف نظر آتی ہے۔

تاہم، سلیم منصور خالد (لاہور، پاکستان) نے واٹس ایپ پر مجھے ارسال کی گئی اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے: ''یہ ۱۹۷۷ کی بات ہے کہ ہم تین دوستوں نے مولانا مودودی کی تحریروں اور گفتگوؤں سے مختلف شخصیات کے بارے میں اقتباسات مرتب کرنے کا ڈول ڈالا۔ ان دوستوں میں شامل

تھے: سمیع اللہ بٹ اور خالد ہمایوں۔ جونہی مجموعے کی شکل بنی تو دوستوں نے کہا: اس کو چھپواتے ہیں، مگر مجھے اس کی فوری اشاعت سے اتفاق نہ تھا کہ ابھی خاصا کام باقی ہے اور ترتیب و تدوین بھی معیاری نہیں ہے۔ بہرحال یہ طے ہوا کہ پہلے مولانا سے اجازت تو حاصل کر لی جائے۔ ہم کتابت شدہ مسودہ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا: ''ایک ہفتہ بعد معلوم کر لیجیے''۔ ہفتے کے بعد مولانا کے ہاں پہنچے تو انھوں نے فرمایا: ''دیباچے کے لیے ملک غلام علی کو دے دیجیے''۔ اور پھر کتابت کا لفافہ واپس کرتے ہوئے تین چار کتابت شدہ صفحات نکال کر ایک طرف رکھتے ہوئے فرمایا: ''اسے رہنے دیں، شامل نہ کریں''۔ وہ کتابت شدہ صفحات سرسید احمد خاں کے بارے میں مولانا محترم کے چند در چند تنقیدی تبصروں پر مشتمل تھے، میں نے سوال کیا: ''مولانا، انھیں کیوں نکال دیں؟'' مولانا نے بڑی شفقت سے فرمایا: ''دیکھیے، سید احمد بنیادی طور پر مذہبی شخصیت نہیں تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی تہذیبی، علمی، معاشی، اور تمدنی تباہی کا ایک نہ ختم ہونے والا منظر دیکھا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو مسلمانوں کے لیے بربادی کا عمل تیز سے تیز تر ہوگا، اسی لیے انھوں نے انگریز ہندو اتحاد کے خطرات سے بچنے کے لیے، دوسرے قوم کو جدید تعلیم کے ذریعے آگے بڑھنے کے لیے ایک قومی مصلح اور خدمت گزار کی حیثیت سے جاں توڑ کوششیں کیں۔ مگر اس کے ساتھ ظلم یہ کیا کہ بے جا طور پر الٰہیاتی اور دینی علوم پر بھی خامہ فرسائی شروع کر دی جس کی نہ گنجایش تھی، نہ ضرورت تھی اور نہ کوئی جواز۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس ہمہ گیر ابتلا کے دوران قوم کو ریاستی دھارے میں لانے کے لیے اپنی سی بھرپور کوششیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نے ان کے مذہبی تفردات و خیالات کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہ اسے قبول کیا مگر قومی مفاد، بیداری اور تعلیم کے لیے ان کی کاوشوں کو قبول کیا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہمیں ان کی قابلِ قدر اور مثبت خدمات کی قبولیت کے لیے، نیز ان کی کاوشوں کے منفی پہلوؤں اور غلطیوں سے درگزر کے لیے ان کی مغفرت کی دعا کرنی چاہیے اور ان بحثوں کو نہیں اٹھانا چاہیے''۔ (۴۴)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی 'مجالس سید مودودی' میں رقم طراز ہیں: ''سرسید احمد خاں مرحوم کے بارے میں ایک صاحب نے کوئی سوال کیا تو مولانا نے فرمایا: ''مذہبی لحاظ سے انھوں نے بہت سی

ٹھوکریں کھائیں اور کئی مسائل میں ان کی تحقیق ناقص تھی، مگر جو کچھ انھوں نے کیا اس میں بدنیتی شامل نہیں تھی۔ اپنے نزدیک وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ دین کی حفاظت کی کوشش کررہے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے۔ انھوں نے بعض چیزیں بڑے درد کے ساتھ لکھی ہیں، مثلاً: برطانوی مستشرق سرولیم میور نے جب اپنی کتاب دی لائف آف محمد (The Life of Muhammad) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر حملے کیے تو سرسید نے بڑی محنت کے ساتھ اس کے جوابات لکھے۔ پھر یہ کہ آج کل کے بعض نام نہاد 'مجتہدین' کی طرح وہ محض نقال نہ تھے۔ انھوں نے جو بات کہی، اپنی ذاتی تحقیق کے بعد کہی''۔(۴۵)

● **علی گڑھ میں 'ترجمان القرآن' کے خریدار**: 'تذکرۂ سیّد مودودی' کے مرتبین نے مولانا کے رجسٹروں کی مدد سے ستمبر ۱۹۴۰ میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' کے خریداروں کی ایک طویل فہرست بھی شامل کی ہے۔ علی گڑھ کے مندرجہ افراد اُس فہرست میں شامل ہیں:

پروفیسر سید ظفرالحسن، ڈاکٹر افضال قادری، دی اسکالر یونین مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، صالح بیگم شروانی غریب منزل علی گڑھ، شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب طبیہ کالج علی گڑھ، اصغر علی صاحب، پروفیسر حلیم پرووائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، راحیلہ خاتون شروانی، محمد عبدالشکور خاں شروانی، ناظم دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، ڈاکٹر محمود احمد نائب صدر اسلامیات علی گڑھ، ملک عنایت اللہ نسیم علی گڑھ، مفتی عبدالعزیز، ابوبکر احمد حلیم، معتمد آفتاب مجلس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، لٹن لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، حاجی علی بخش سلطان محمود، بیگم سید محمد منیر، سیشن جج علی گڑھ، عبدالمجید، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، پرنسپل ہنری مارٹن اسکول علی گڑھ۔(۴۶)

حواشی وتعلیقات

(۱) 'عکس راہ'، عبدالعزیز سلفی فلاحی۔ شعبۂ اشاعت: اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا، نئی دہلی

(۲) مجدّد سید مودودی نمبر، ماہنامہ 'حیات نو'، جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء

(۳) 'تذکرۂ سیّد مودودی'، اوّل [مرتبہ: جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد] ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء، صفحہ ۳۲۵

(۴) 'علی گڑھ میگزین' ۹۵-۱۹۹۷ء/ انٹرویو، بتاریخ ۱۴ مئی ۲۰۱۴ء بمقام علی گڑھ

(۵) 'دھوپ چھاؤں'، ریاض الرحمٰن شروانی، حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔/ انٹرویو بتاریخ ۲۹/اپریل ۲۰۱۴ء بمقام حبیب منزل
(۶) انٹرویو، بتاریخ ۱۴/مئی ۲۰۱۴ بمقام سرسید نگر، علی گڑھ
(۷) 'علی گڑھ میں چار سال'، محفوظ الحق حقی علیگ، پندرہ روزہ 'خبرنامہ'، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۵فروری ۱۹۸۲ء
(۸) ہفت روزہ 'دعوت'، نئی دہلی، ۶ جولائی ۱۹۸۰ء
(۹) 'تذکرۂ سیّد مودودی'، اوّل، صفحہ ۳۲۰، ۳۲۱۔ (محمد یوسف بُھٹہ، مصنف: ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں)
(۱۰) 'تذکرۂ سیّد مودودی' اوّل، صفحہ ۴۰۰۔ (پروفیسر آسی ضیائی کا وطن رامپور، یوپی اور ان کا اصل نام امان اللہ خاں تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں لاہور پاکستان منتقل ہوگئے تھے۔ پبلک لائبریری رامپور کے صدر مولوی ضیاء اللہ خاں اُن کے والد تھے)۔
(۱۱) 'تذکرۂ سیّد مودودی'، اوّل، مضمون بعنوان'' بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو''صفحہ ۴۸۵ تا ۴۸۸۔ (پروفیسر سید محمد سلیم کا وطن میوات کے علاقہ تجارہ، ریاست الور میں تھا۔ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ سے فارغ ہوکر اپنے وطن واپس گئے تو وہاں ایک دار المطالعہ اور لائبریری قائم کی اور نوجوان طلبہ کو جماعت اسلامی سے متعارف کرایا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ان کا قصبہ فسادات کی زد میں آیا اور ہندو بلوائیوں نے مکمل طور پر تباہ کردیا تو وہ بالآخر ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے اور نواب شاہ سندھ میں سکونت اختیار کی۔
(۱۲) انٹرویو بتاریخ ۹/اپریل ۲۰۱۴، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ
(۱۳) 'حکیم سید ظل الرحمان: حیات و خدمات'، مرتبین: ڈاکٹر سید حسن عباسی' ڈاکٹر عبداللطیف۔ مرکز تحقیقات اردو و فارسی' باقر گنج، سیوان، بہار
(۱۴، ۱۵، ۱۶) 'ادبیات مودودی'، مرتبہ خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶۔ اشاعت مئی ۱۹۸۰ء۔
(۱۷) 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'، ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، اگست ۱۹۴۰ء
(۱۸) ہفت روزہ 'صدق' لکھنؤ یکم تا ۸ دسمبر ۱۹۴۰ء۔ (یہ مجلہ عبدالماجد دریابادی نے یکم مئی ۱۹۳۵ء کو جاری کیا تھا۔ اس سے قبل 'سچ' نکلتا تھا۔)
(۱۹) عبدالرحمٰن عبد، 'مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی'، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔
(۲۰) گفتگو بتاریخ ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۷ء بمقام بدر باغ، علی گڑھ
(۲۱) ہفت روزہ 'دعوت'، نئی دہلی، ۶ جولائی ۱۹۸۰ء (۲۲) عبدالرحمٰن عبد، ایضاً
(۲۳) 'عکس راہ'، عبدالعزیز سلفی فلاحی، شعبۂ اشاعت: اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا ۱۵۱ سی ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵۔

(۲۴) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، اپریل ۱۹۴۱ء (۲۵) ماہنامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، جولائی ۱۹۴۰، صفحہ ۴۰۸ (۲۶) 'ترجمان القرآن'، لاہور، جمادی الآخر ورجب ۱۳۵۶ھ (۲۷) ماہنامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، دسمبر ۱۹۴۰ء، جنوری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۴۱ (۲۸) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، بابت مئی-جون ۱۹۴۴ء، جلد ۲۴ عدد ۶۰۵ (۲۹) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، لاہور، بابت دسمبر ۱۹۴۱ء و جنوری، فروری ۱۹۴۲ء، جلد ۱۹، عدد ۴، ۵، ۶ (۳۰) ایضاً (۳۱) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، فروری ۱۹۳۷ء

(۳۲) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، محرم ۱۳۵۷ھ، مطابق مارچ ۱۹۳۸ء۔ (ماہ نامہ 'ترجمان القرآن' کی فروری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شامل ایک رپورٹ کے مطابق: لارڈ لوتھین کی ایما پر اس کے ایک دوست نے جو انگلستان میں رہتا ہے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو ایک چغہ ہدیہ کے طور پر دیا ہے جس پر تمام قرآن مجید لکھا ہوا ہے۔ یہ چغہ غدر ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستان سے انگلستان بھیج دیا گیا تھا اور اب مسلمانوں کے ساتھ دوستی کی علامت کے طور پر ہندوستان کو واپس دیا گیا ہے''۔

(۳۳) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ/ اگست ۱۹۳۶ء

(۳۴) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ/ اگست ۱۹۳۶ء (مئی ۱۹۵۷ء میں یہ مقالہ تعلیمات کے نام سے مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، رامپور نے شائع کیا تھا)۔

(۳۵) 'تذکرۂ سید مودودی'، اوّل، صفحہ ۱۰۷-۱۱۴

(۳۶) ہفت روزہ 'صدق' لکھنؤ، ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۰ء

(۳۷) پندرہ روزہ 'ہمقدم'، علی گڑھ ۵/اکتوبر ۱۹۷۹ء ۴ عبدالقادر مارکیٹ، جیل روڈ، علی گڑھ

(۳۸) ماہنامہ 'معارف'، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، فروری و مئی ۱۹۴۱ء

(۳۹) ہفت روزہ 'صدق' لکھنؤ، ۲۷/جنوری ۱۹۴۱ء

(۴۰) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۳۶ء ص ۴۲۸

(۴۱) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، ستمبر ۱۹۳۴ء

(۴۲) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۳۴ء

(۴۳) ماہ نامہ 'ترجمان القرآن'، دسمبر ۱۹۴۰ء، جنوری ۱۹۴۱ء، صفحہ نمبر ۱۴۱

(۴۴) سلیم منصور خالد کا تحریری پیغام بذریعہ واٹس ایپ، بتاریخ ۲۴/اگست ۲۰۲۲ء

(۴۵) 'مجالس سید مودودی'، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، دسمبر ۲۰۲۰ء ناشر منشورات، منصورہ ملتان روڈ، لاہور

(۴۶) 'تذکرۂ سیّد مودودی'، اوّل، ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء، صفحہ ۹۸۹